ترجمہ نگاری: چند پہلو

ڈاکٹر احمد سہیل

اردو کے ادبی نظریات کے تاریخی تناظر میں جب بھی مباحث شروع ہوتے ہیں تو ابتدا اردو تراجم سے ہی ہوتی ہے کیوں کہ اردو کے ابتدائی تراجم اور ان کے ماخذات سے ہی اردو کی ادبی تاریخ کو ایک مکمل "کل" کے ساتھ اور ترتیب وار تناظر میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ترجمے کے نظریاتی مباحث بہت الجھے ہوئے ہیں۔ کئی تصورات کو اس حوالے سے اتنا الجھایا گیا ہے کہ ترجمے کا نظریاتی آفاق ابہام اور پیچیدگیوں سے دوچار ہوگیا۔ ترجمے کو جب بھی مخصوص نظریاتی فریم ورک میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات ذہن میں ضرور آتی ہے کہ ترجمے کے آفاق کو آفاقی اصولوں، اصطلاحات اور ضوابط اور مخصوص ہائے نظام کے تحت شعور میں لاکر اس کی تفہیم وتشریح کی جائے۔ اسے نظریاتی لسانی عملیات کے معروضی وظائف اور اصولوں کی تشریحات بھی تصور کیا گیا ہے۔ ترجمے کے نظریے کا ہی اعجاز ہے کہ یہ غیر ملکی زبان کی ہیئتوں، تشکیلات اور معنویت کو فکری اجتہاد کی مدد سے لارموز کرتا ہے۔ فکر کے نئے دروازے کھولتے ہوئے ایک تمدن کو دوسرے تمدن کی اقدار ونظریات سے متعارف کرواتا ہے، جس میں تین لسانی رویے شناخت کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) زبان کا ماخذ

(۲) زبان کا ہدف

(۳) نفس مضمون

مترجم انھی تین نکات کی بنیاد پر دیے ہوئے متن میں پوشیدہ لسانی معنویت کو آشکار کرتا ہے جو بہت سوں کی نظر میں تخلیق نو ہوتی ہے۔ اس سے زبان کا ہدف اور ماخذات ابھرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ زبان کے ہدف کی ساخت بگڑ گئی ہے۔ دراصل یہ ہدف یافتہ زبان کی تبدیلیوں کو

رموزیات کے ساتھ متن میں موجود پیغامات کو ایک ثقافتی فضا سے باہر نکال کر دوسری ثقافتی فضا میں رکھ دیتے ہیں مگر ترجمے کی زبان میں اس وقت تک "عالمی معروض" کی آمیزش نہیں ہوتی جب تک اس کی تفہیم ترجمہ کرنے والی دوسری زبان کی ثقافت کے شعور کا حصہ نہ بنے لیکن ترجمہ زبان کے جبر سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کرتا مثلاً کسی تحریر کا ایک زبان میں ترجمہ ہو کر دوبارہ پھر اسی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے۔ جس کو ترجمہ در ترجمہ کا عمل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال "قصہ چہار درویش" ہے جو پہلے میر عطا حسین تحسین نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ زبان ولسان کی سطح پر زیادہ رواں اور سلیس نہیں تھا کیوں کہ اس میں عربی فارسی کے کئی ایسے غیر مانوس الفاظ کی بھر مار تھی جو تحسین کے اس ترجمے کو قبولیت نہ بخش سکی مگر اس تصنیف کو بعد میں اردو میں میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" کے نام سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور اسے قبولیت حاصل ہوئی۔ اسے مغربی ادبی اصطلاح میں بین اللسان (Intralingual) کہا جاتا ہے۔ ایک اور صورت حال دو زبانوں کے درمیان ترجمے کی ہوتی ہے۔ جو ترجمے کا سب سے عام طریقہ کار ہے اسے انگریزی اصطلاح میں بین اللسان (Intralingual) کا نام دیا گیا ہے۔ تیسری قسم نشانیات کا ترجمہ ہوتی ہے اس کے لیے انگریزی میں بین المعنیات (Intersemiotic) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ ایک اور ترجمے کی قسم یہ ہے کہ براہ راست زبان سے ترجمے نہیں کیے جاتے۔ اردو کے بعد اردو بولنے والے جس غیر ملکی زبان سے سب سے زیادہ قریب ہیں وہ انگریزی زبان ہے لہٰذا عربی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی، جاپانی، چینی ادب سے اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کی وساطت سے ہی ہوئے۔ مگر اس صدی سے کوئی دو عشرے قبل اردو میں ایسے مترجم بھی دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے فرانسیسی، جرمن، چینی، عربی، فارسی، ہندی سے براہ راست ترجمے کیے۔ ترجمے کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ جس میں مترجم اصل متن کو پڑھنے سے قاصر ہوتا ہے یا اس کی اتنی استعداد نہیں ہوتی کہ وہ اس سے معاملہ کر سکے مگر اس کو متن کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ کسی سے متن کی قرأت کروالیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہندی شاعری ہے۔ اردو کے بہت سے مترجمین کو ہندی نہیں آتی وہ کسی سے مسودے کی قرأت کروا کے اس کو اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔

جدید ترجمے کے نظریات میں مخصوص قسم کے موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔ ان موضوعات پر عمیق مطالعہ ہی مترجم کے لیے بہتر تصور کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ ترجمے کے آفاق کا احاطہ کرتے ہوئے ایک روشن خیال عملی، علمی تناظر کے علاوہ منہاجیات کی نت نئی صورتیں تشکیل دیتے ہیں۔

(۱) لسانی نظریہ (۲) نحو (۳) نشانیات (۴) تاریخ لسان اور تقابلی لسانیات (۵) ترجمے کے

نظریات (۶) تاریخ اور زبان کی لسانیات (۷) تجرباتی لسانیات (۸) معاشرتی لسانیات (۹) نظریاتی لسانیات (۱۰) قواعدیات (۱۱) تفہیمات وتشریحات (۱۲) مشینی وبرقیاتی خودکار تراجم۔

تراجم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے، ترجمہ ہی ادب کی تہذیب وتمدن کے ارتقا اور رسائیوں کا کھوج لگانے میں مدد دیتا ہے اور تراجم کے نظریاتی منہاجیاتی اور مابعد نظریات احاطے میں لاتے ہوئے ترسیلی، تسلیماتی، تفہیماتی، تفتیشی (Heuristic) اشتقاقی، اسطوری اور علمیاتی کی اصناف وغیرہ کی تشریح کرتی ہے۔ افورزم کی اصطلاح کے تحت تراجم کے متن کو مکمل نفس مضمون کے ساتھ چند سطروں میں منتقل کرنا بھی ہنرمندی ہے۔

ترجمہ بنیادی طور پر لسانی فن ہے، اس کی ابتدا بھی لسان سے ہی ہوتی، زبان کے ساتھ ہی وسعت بھی پاتی اور زبان کے ساتھ ہی اپنا اختتامیہ بھی کرتی ہے۔ ترجمے میں زبان کا ہدف زبان ہی ہوتا ہے۔ ترسیل، تفہیمات، تشریحات واشتقاق وغیرہ کے مسائل بعد میں آتے ہیں لیکن ادب کو ترجمے کے حوالے سے پڑھتے ہوئے قاری اور ادیب کے درمیان معنیات کی گنجلک صورت حال ابھرتی ہے مگر تفہیماتی تراجم میں معنی میں معنویت کشید کی جاتی ہے اور مفہوم ومعنیات کو نئے انسلاکات کے ساتھ پرکھا جاتا ہے۔ اسے حتمی ''نظریہ تشریح'' کی سعی بھی کہا گیا ہے۔

تراجم کے نظریات میں تین عناصر اہم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہی عناصر تراجم میں اپنی موجودگی کا حاوی طور پر احساس دلواتے ہیں مگر پھر بھی تراجم کے میدان میں یہ مسئلہ ہمیشہ رہتا ہے کہ اس میں ابہام اور تشکیک کا تناسب بھی اچھا خاصا ہوتا ہے جو اصل تخلیقی معروض سے انکار کا سبب بھی بن جاتا ہے کیوں کہ جب سے ترجمہ قدیم زبان سے تحریری طور پر نہیں مگر زبانی طور پر ابلاغ ہو رہا ہے۔ جب فرد کے پاس الفاظ نہیں تھے اور الفاظ کی ترتیب دینے کی اہلیت ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتی تھی۔

لفظ بولتا ہے، مکالمہ کرتا ہے، سوالات اٹھاتا ہے، تشریح کرتا ہے اور تفہیم کی راہیں کھولتا ہے۔ ارسطو زبان کو ''ذہنی پیکر'' کہتا ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ کی علامتوں کے سبب ہی کی مدد سے تکلمی زبان وجود میں آتی ہے اور لسانی حوالے سے متن اور تراجم کا مخاطبہ (Discourse) معروضی ودستاویزی ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ معاشرتی عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ گڈامر نے اس سلسلے میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ لسانیات بنیادی طور پر زبان اور انسانی وجود کے مابین اتصال کا سبب ہوتی ہے۔ تشریح کبھی بھی معروضیت کے بغیر تسخیر نہیں ہو پاتی۔ فرد اس لیے زبان استعمال کرتا ہے کہ اس وسیلے سے وہ معنویت، معنیات، مفاہیم کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر معنویت کے اس کھیل میں جب بھی تشریح وتفہیم کی ضرورت ہوتی ہے تو بعض

دفعہ الفاظ غیر متعصب ہوتے ہوئے بھی متعصب ہو جاتے ہیں۔ انسانی افعال کی ترسیل ہوتی ہے مگر اس سے مکمل طور پر انسانی صداقتوں وحقائق کی تفہیم نہیں ہو پاتی۔ اس عمل کے دوران یہ ضرور ہوتا ہے کہ لسانی نظام میں چھپے ہوئے رموز کو کئی بار لا رموز کیا جاتا ہے جس میں قواعد یاتی، بشریاتی، عمرانیاتی تعلقات کو معنویت کے ادراک میں ایک تکنیکی پیانے کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسی عمل کے درمیان کئی معروضات بھی ابھرتے ہیں۔ جو مترجم یا قاری کو تذبذب میں ہی نہیں ڈالتے بل کہ تراجم کی روانی میں رخنے بھی ڈالتے ہیں۔ پھر علومیاتی انسلاک سے مبادلیاتی رویے ابھرتے ہیں اور مختلف تناظرات میں تقابل کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

ترجمے کا اصل مسئلہ ابلاغ کا بھی ہے جس میں لسان وزبان کی منتقلی سے ترجمے کا عمل شروع ہوتا ہے یعنی ترجمے میں اصل ہدف تو ایک طرف اقدار کی منتقلی بھی دکھائی دیتی ہے اور قاری اپنی حسیت سے نئی جمالیات بھی تشکیل دیتا ہے اور اصل لکھاری کے تخلیقی متن کو نئی تاثراتی فضا میں بھی لے جاتا ہے۔ مترجم کا متن سے قلبی اور ذہنی لگاؤ ہونا لازمی ہے۔ اسلوب کو خلق کرنا اس کا کام نہیں۔ مراد یہ کہ ترجمہ اس طرح کا ''سرگرم ابلاغ'' ہے تو دوسری جانب متن کا لسانی تجزیہ بھی معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی مترجم کو اس ذمہ داری کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ وہ متن کی اصل حرکیات، جمالیات اور ماخذات سے شعوری تعلق رکھے۔ یہ تمام عوامل ادبی تراجم میں زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور ابلاغ اور اظہاریت کی ہنرمندی سے ہی اصل ترجمہ ممکن ہو پاتا ہے، ساتھ ہی ترجمہ کرنے والے کو متن سے معاملہ بندی کرنا بھی آنا چاہیے۔

ترجمے کے آفاق میں دو فکری تناظر اہم ہیں جن میں ایک نسبتیت اور دوسرا اضافیت جس کا تعلق فلسفیانہ ادراک سے ہوتا ہے جو کہ طرز فکر سے منسلک ہو کر عمومی نوعیت کے حیاتیاتی اور جنسیاتی عناصر سے جا ملتے ہیں جو مترجم کے ذہن میں ہیئت کی آگہی کا پتا دیتے ہیں۔ یوں تنقید ذات اور ذات کے ارتقا کا تقابل ہو جاتا ہے اور یہ ترجمے کے معروضی احوال یا اہلیت قرار پاتے ہیں کیوں کہ مترجم ایک ثقافت کو خلق کرتا ہے اور دوسری قسم یعنی اضافیت میں ردعمل کا تناظر اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ آفاقی اضافیت کا طریقہ عمل سے نفسیاتی حیاتیاتی اور متعین قسم کی ترجماتی ہیئت ابھرتی ہے اور آفاقی عقلیت پسندی سے ترجمہ ہونے والے متن کا ''نحو'' ایک سا لگتا ہے لیکن صوتی اور لسانی آہنگ میں تفاوت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان ہی ترجمے کے ذریعے ''دوسرے'' قاری کو دریافت کرتی ہے۔ یہ سب عقلیت کا آفاقی نظام و تناظر ہے۔

مترجم متن میں صداقت کا سراغ بھی لگاتا ہے اور ثقافتی تقابل کے بعد لسانی نظام میں جو تفاوت اور تحریمات کا تصادم ہے وہ بھی اپنے ترجمے کو ہدف میں شامل کرتا ہے مگر اصل متن کو متنی سطح پر معروضیت عطا نہیں کرتا ہے کیوں کہ ترجمے کے متن کا قاری اپنی مخصوص حیثیت سے وہ باتیں بھی خلق کر لیتا ہے جو کہ اصل مصنف اور مترجم کے ادراک میں بھی نہیں آتیں اور پھر مترجم ہدفِ متن سے اخلاقی اور تکنیکی طور پر وابستہ بھی ہوتا ہے اور یہی وابستگی مختلف نوع کے ثقافتی نتائج کے ادراک کی متعلقات سے باہم ہو کر ترجمے کا ''کل'' حاصل کرتے ہیں۔ یہی تمام عوامل اور اصل اسلوب کو ممکن طور پر تزئین کر کے نئے نظریاتی اور عملی رموز کو تسخیر بھی کرتے ہیں۔ موضوع اور معروض کو ترجمے کے عمل میں دو اہم جہات تسلیم کیا گیا ہے۔ موضوع سے مراد ''قاری'' اور ''مترجم'' ہوتا ہے اور معروض ''اصل متن'' کو تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا مترجم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قاری سے مطابقت پیدا کرے۔ مگر ترجمے کے عمل میں تفہیمی سطح پر مصنف، متن اور قاری کی تکون کے ترجمے کی ''تخلیق'' ممکن ہوتی ہے۔ اُردو میں تراجم کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان کی تاریخ و روایت ہے۔ اردو ترجمہ کے سبب ہی اردو لسان و زبان کی نشوونما ہوئی اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں پروان چڑھی۔ اُردو میں تراجم کا سلسلہ سترھویں صدی کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء میں ''سب رس'' لکھی جو دکنی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ ''سب رس'' شاہ جی نیشاپوری کی فارسی کتاب ''دستور عشاق'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کو اردو زبان کی پہلی رزمیہ تحریر بھی کہا جاتا ہے۔ نصیر الدین کی تحقیق کے مطابق ملا وجہی نے وجیہ الدین کی گجراتی کتاب کو ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے ایک اور تحقیق کے مطابق اپنے زمانے کے صوفی اور شاعر شاہ میران جی (۱۴۹۶-۱۵۶۱) کی کتاب خدانما (دکن) اردو میں ترجمہ کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ میران جی کا تعلق قطب شاہی زمانے سے تھا۔ حامد حسن قادری صاحب، شاہ میران جی کے اس ترجمے کو مشہور عربی مصنف ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا ترجمہ بتاتے ہیں جو ۱۶۰۳ء میں رقم ہوا۔ ۱۶۷۳ء میں ایک کتاب جس نے اردو کے ترجمے کے آفاق میں نیا اضافہ کیا۔ اس کے مترجم کا نام میراں یعقوب ہے۔ انھوں نے دکن کے عمادالدین زبیری کی کتاب ''شمائل الاتقیا'' کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس ترجمے میں تصوف کے مباحث تھے۔

اٹھارھویں صدی (مغلیہ دور) میں شاہ ولی اللہ قادری نے ۱۷۰۴ء میں شیخ محمود کی فارسی کتاب ''معرفت السلوک'' کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کے بعد عربی فارسی سے اردو میں ترجموں کا سلسلہ چل نکلا۔ طوطی نامہ کربل کتھا، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر کا قرآن حکیم کا اردو ترجمہ، تحسین کی نوطرز مرصع

جیسے تراجم کے بعد جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، مرزا کاظم علی جوان، مرزا علی لطف، مولوی امانت اللہ شہید، شیخ حفیظ الدین، مظہر علی خان ولا، خلیل علی خان اشک، للولال جی، میر بہادر علی حسنی، اکرام علی اور بینی نرائن کے نام اردو کے چند اہم مترجمین کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر محمد حسین کلیم دہلوی، حکیم شریف خان دہلوی، رجب علی بیگ سرور، کپتان ٹیلر، کپتان ٹامس روبک، جان پارکس لیڈک، نظام الدین چشتی، ہر چند گھوش، فقیر محمد گویا نے اردو تراجم میں بڑا نام کمایا۔ اسی زمانے میں اردو میں بہترین تراجم کا سفر جاری رہا۔ مغرب و مشرق کے تقریباً ہر اہم کلاسیک کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے (فہرست طویل ہے)

ترجمے کو معاشرتی جبر سے بھی منسلک کیا گیا ہے۔ معاشرتی احوال سے بے چینی، بے اطمینانی، انسانوں کے ہاتھ انسانوں کا استحصال، نوآبادیات، سرخ، سفید اور نیلے سامراج کا پھیلاؤ، لاطینی امریکا میں سامراجیت کی ہٹ دھرمی، کمیونزم کا شور، امریکا اور افریقا میں نسلی تعصبات، ہندوستان پاکستان میں ایمرجنسی، مذہبی جنونیت، پاکستان میں وقفے وقفے سے مارشل لا کا نفاذ، شخصی آزادی کی سلبی، نئے ورلڈ آرڈر کا نقارہ، نائن الیون کے بعد کی عالمی صورت حال نے ترجمے کے آفاق کو وسیع کیا۔

موجودہ دنیا اختصاص کی دنیا ہے۔ ترجمے کو بھی اب تکنیکی عمل تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ برقیاتی اور الیکٹرانک ترقی نے ترجمے پر اپنے مثبت تکنیکی اثرات ڈالے ہیں۔ اب مشینی طریقے سے سیکنڈوں میں ایک متن کو دوسرے لسانی متن میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اسی کی مثال ابھی چند سال قبل ہونے والی برقی اور مشینی ترجمے سے دی جا سکتی ہے۔ مجھے اپنے ایک ایکوڈور (جنوبی امریکا) کے دوست کو مبارک باد کے لیے "کارڈ" بھجوانا تھا۔ اس کو انگریزی بہت کم آتی ہے۔ ہسپانوی زبان لکھنا میرے لیے ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ میں نے پہلے کمپیوٹر سے مبارک باد کا کارڈ منتخب کیا۔ انگریزی میں مبارک باد کے کلمات لکھے پھر ہسپانوی زبان میں ایک سیکنڈ میں اس کا ترجمہ ہو گیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین (مانیٹر) پر مختلف زبانوں کے نام درج تھے اس میں زبان کا انتخاب کر کے Keyboard پر صرف Enter کا بٹن دبایا اور پلک جھپکتے ہی پورا متن انگریزی سے ہسپانوی زبان میں منتقل ہو گیا۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہوا کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان ترجمے کے لیے موجود تھی مگر اُردو کا نام کہیں نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بازار میں اب تو تراجم کے لیے "ڈش" بھی مل جاتی ہے۔

شروع کے دنوں میں جب اُردو ترجمہ کا زور ہوا تو لگتا تھا کہ ادبی سطح پر مترجم کی جگہ ادب میں اس

طرح نہیں بن پائی جیسے شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد وغیرہ کو قدرے منفرد حیثیت سے دیکھا گیا لیکن ایک عرصے تک اردو میں مترجم ''منشی'' سے آگے نہ بڑھ سکا مگر بیسویں صدی میں اور اس کے بعد اردو ترجمے کی دنیا میں پڑھے لکھے اور مستحکم ذہن کے معروف ادیب وشعرا نظر آتے ان لوگوں نے اردو میں بہترین ترجمے کیے۔ بعض نے منھ کا ذائقہ بدلنے یا کاروباری نقطۂ نظر سے بھی تراجم کیے اور تراجم میں یہ لوگ زیادہ سنجیدہ نہیں تھے اور ترجمے کے فن کو ''دل لگی'' تصور کرتے تھے مگر بعد میں ترجمے کی اہمیت کو اردو میں جلد ہی سمجھ لیا گیا اور وقت نے دیکھا کہ یہ ترجمے اردو ادب کا سرمایہ بنے۔ خاص طور پر پچھلی صدی میں مغرب و مشرق سے اردو میں بہترین ترجمے ہوئے یہ تمام ترجمے کے مشہور اور معروف ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ قدرے کم معروف لکھنے والوں نے کیے جن میں محمد حسین آزاد، سر عبدالقادر، عبدالحلیم شرر، ہادی رسوا، سجاد حیدر یلدرم، پریم چندر، حسرت موہانی، ظفر علی خان، رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحق، عزیز لکھنوی، ضامن کنستوری، غلام بھیک نیرنگ، تلوک چند محروم، منشی عنایت اللہ، نادر کوروی، حافظ محمود شیرانی، مخمور جالندھری، میرا جی، منٹو، ن م راشد، علی سردار جعفری، احمد علی، فیض، اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، جمیل جالبی، مجنوں گورکھپوری، محمد احسن فاروقی، انتظار حسین، محمد ہادی حسین، محمد سلیم الرحمان، ابن انشا، فہیم اعظمی، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، انور زاہدی، منیر الدین احمد، اجمل کمال، ضمیر احمد، سید کاشف رضا، آصف فرخی، نگہت رضوی، محسن بھوپالی، حسن عابدی، حیدر جعفری سید، آشا پر بھارت، ارمان نجمی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔

اردو ادبی رسائل نے بھی ترجمے کے رجحان کو مستحکم بنانے میں مؤثر حصہ لیا۔ ایک زمانے میں ''دلگداز'' اور ''مخزن'' میں بڑے پائے کے تراجم شائع ہوتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی رسائل ماہِ نو (لاہور)، ادب لطیف (لاہور) اور پھر ۸۰ء کے عشرے میں کراچی سے ''آج'' اور اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کراچی کے ہی ایک کتابی سلسلے ''دنیا زاد'' میں بہترین ترجمے پڑھنے کو ملے جو کہ جدید ترین عالمی حسیت سے اردو سے روشناس کرواتے ہیں۔

یہ بات ہم جانتے ہیں کہ ترجمہ تحریری اور زبانی سطح پر ایک قدیم ترین انسانی مشق ہے اور ترجمہ ہی قاری کے لیے ممکنہ طور پر دیگر ثقافتوں کے مابین ابلاغ کر پاتا ہے۔ جس میں قاری مرکوز طور پر بیٹھی متن کے سیاق کو پائے ہوئے سیاق کی تمام کی تمام وظائفیت مزاج (بیوپار) کی حرکیت کو اپنے اندر سمو لیتا ہے لہٰذا یہ نہ تصور کر لیا جائے کہ تمام تراجم کا سیاق معروضی ہوتا ہے مگر ترجمے کا فن اختصاصی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن ترجمے کے مخاطبے (ڈسکورس) میں تصویر کچھ یوں بن جاتی ہے جو ترجمے کے ابلاغ کے تناظر میں

پوشیدہ متنی ہیئت بھی ثابت ہوتی ہے۔

raheem 23-04-08\intiqad\pec-1.jpg not found.

بنیادی طور پر ترجمے کے نظریے کی چار سطحیں دریافت کی گئی ہیں۔

(۱) متن لسانی: (ہدفِ متن، دیگر متعلقہ متن)

(۲) ادراکی سطح: مترجم کا فیصلہ اور منہاجیات)

(۳) عمرانیاتی سطح: (ترجمے کا عمل، ترجمے کے مقاصد، قاری سے انسلاک، اختتامیہ)

(۴) ثقافتی سطح: (نظریاتی عناصر، ثقافتی ارتقا، مضبوط (بہ قوت) انسلاکات)

دراختتامیہ

ہر زمانے میں ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ نئے انکشافات، دریافتیں اور جدتِ حیات انھی کے سبب ممکن ہوتی ہے۔ اگر ادب زندگی کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور ادب کو ہی تنقیدِ ذات اور نقدِ معاشرت گردانتا ہے تو ترجمہ بھی ادب کا ایسا نقد فراہم کرتا ہے جو دو تہذیبوں کا تقابل کر کے نئی حسیت کو جنم دے کر فرد کے شعور میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ترجمہ تہذیب و تمدن کی علامت ہے۔ ادبی تراجم کے سہارے سے قاری اپنی تنگ و تاریک دنیا سے نکل کر دوسری فضا میں سانسیں لیتا ہے اور نئی جمالیات، حسیت، نئی معاشرتی اقدار اور تحریمات سے اس کو معاملہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ ترجمے کا انسلاک ذہنی مزاج (رویّوں) سے متعلق ہوتا ہے۔ مترجم ہی کا نہیں بل کہ قاری کے لیے بھی یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف تو ایک زبان کو خوش آمدید کہہ رہا ہوتا ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی زبان کے ''غلبے'' کو اپنے اوپر حاوی کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی مقامی زبان پر ''قل'' پڑھ رہا ہوتا ہے۔ یوں زبان کی تقسیم کا احتمال بھی ہوتا ہے مگر ترجمے کے حوالے سے فرد کی جمالیات، حسیت اور انسانی جذبات کو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ ترجمہ بعض دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے ناپسندیدہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ ترجمہ فکری و ذہنی کشادگی سے عبارت ہوتا ہے۔ ترجمہ ہو جانے کے بعد ترجمے کی تفہیم اور تشریحِ متن وقت کے ساتھ ساتھ نئی معنیات اور مفاہیم کے نئے گوشوں کی دریافت کا عمل بھی جاری رہتا ہے، جب ترجمہ معنیاتی دائرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی معنیاتی ہیئت، ماہیت اور نفسِ مضمون بھی اصل

ترجمہ شدہ متن سے مختلف ہوتا ہے۔

اس مضمون میں آ گہی کی آ بلہ فریبی کو ادبی مخاطبے کی روشنی میں ادراک میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں تین عنصر اولین نوعیت کے ہوتے ہیں جو کہ ترجمے کی تفہیم کرتے ہیں۔

(۱) مصنف

(۲) متن

(۳) قاری

اور یہی تینوں عوامل ترجمے کی معنویت، معنیات اور نفس مضمون کی ماہیت کو متعین بھی کرتے ہیں۔

سمبل

تزئین: سلیم پاشا
خطاطی: رحیم شاہ
حروف بینی: صابر خاکی
زرِ سالانہ:

اندرونِ ملک: عام ڈاک سے: ۳۰۰ روپے، رجسٹرڈ رکوریئر سے: ۴۰۰ روپے
بھارت: ۶۰۰ روپے، یورپ رامریکا رمشرقِ وسطیٰ: ۱۳۰ امریکی ڈالر

ذرائع ترسیل زر:

منی آرڈر رچیک (جو راول پنڈی راسلام آباد کے بنک سے کیش ہوسکے) بنام سہ ماہی 'سمبل'

ضابطہ:

سمبل میں شائع شدہ کسی بھی تحریر اور اس کے مصنف سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)
سمبل میں شائع شدہ تحریروں کو علمی مقاصد کے لیے بغیر اجازت کسی بھی کتاب، رسالے یا ویب سائٹ میں حوالے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ (ادارہ)

رابطہ:

ای میل: symlit@yahoo.com   alimfashi@yahoo.com
سیل فون: 0300-5582082
خط کتابت رترسیل زر: رانی مارکیٹ، شیخ بھاٹا، راول پنڈی کینٹ

ناشر:

علی محمد

طابع:

الیف۔آئی پرنٹرز، خورشید پلازا، کشمیر روڈ، صدر، راول پنڈی

سہ ماہی سمبل

مدیر: علی محمد فرشی

(شناختِ خاص: بورخیس)

جنوری تا جون ۲۰۰۸ء

جلد: ۲ — شمارہ: ۳/۴

قیمت فی شمارہ: ۷۵ روپے — قیمت موجودہ شمارہ: ۱۸۰ روپے

رانی مارکیٹ، ٹینچ بھاٹا، راول پنڈی کینٹ، پاکستان

مدیر: علی محمد قریشی
سمبل